R. No. 2186/57

Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 4/-
Per Copy-12 P

جلد ۲۶ - شمارہ ۲۳ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ جون ۱۹۶۷ء

آل احمد سرور

اثر صاحب کی یاد میں

لیجیے اثر صاحب بھی ہم سے جدا ہو گئے۔

اثر صاحب ادھر کئی سال سے بیمار تھے۔ فالج کے حملے کے بعد وہ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ گھر سے نکلنا بالکل بند تھا۔ ذہن پر بھی کچھ اثر تھا۔ مگر جب تک وہ زندہ تھے، قدیم لکھنؤ کا ایک ستون موجود تھا۔ اب لکھنؤ میں سناٹا ہے۔ لکھنؤ کی وہ تہذیب جس کا اتنا غلغلہ تھا دیکھتے دیکھتے وقت کے ہاتھوں کچھ سے کچھ ہوتی جا رہی ہے۔ یہ جاگیرداروں کے زمانے کی یادگار تھی، مگر اس میں کچھ بڑے دل آویز نقوش تھے، اس میں ایک حسن تھا، ایک نفاست اور شائستگی تھی، ایک رواداری اور وضع داری تھی، ایک نشاط زیست تھا اور ایک طرحداری، زبان کی نرمی تھی، لہجے کا لوچ تھا، گفتگو میں شیرینی تھی، انسانیت کی کچھ قدروں سے وابستگی تھی، اپنی تاریخ سے ایک محبت تھی، اور اس میں ایک فخر تھا اور زندگی کی رنگینیوں کو جذب کرنے اور خود رنگین ہو جانے کی صلاحیت تھی۔ اثر صاحب اس تہذیب کی بڑی بھرپور نمایندگی کرتے تھے۔ ان سے مل کر جی خوش ہوتا تھا۔ زبان و ادب کی سیکڑوں باریکیوں پر نظر پڑتی تھی، الفاظ کی طاقت اور قوت کا اندازہ ہوتا تھا۔ ان کا متبسم چہرہ، باتوں میں ہلکی سی ظرافت کی چاشنی، الفاظ کا مناسب و موزوں استعمال، ہمدردی اور محبت کی فضا، علم کی سنجیدہ گفتاری اور بڑھاپے کا شعور، پرانے ہوتے ہوئے مغربی میلانات اور جدید تحریکات سے ان کی واقفیت، یہ سب باتیں رہ رہ کر یاد آتی ہیں اور بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ کیسا انسان، کیسا شاعر، کیسا ادیب ہم سے جدا ہو گیا۔

اثر صاحب کا نام تو میں نے اس وقت سے سنا تھا جب شعر و ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ہائی اسکول میں اردو کے استاد مولوی عظمت اللہ لکھنؤ کے جن شاعروں کا اکثر ذکر کرتے تھے ان میں اثر کا نام بھی تھا۔ مگر میری ان سے ملاقات بڑے دلچسپ حالات میں ہوئی۔ ستمبر ۳۰ء میں محمود حسین، مختار حامد علی، سید بشیر الدین اور میں مسوری سے پیدل شملے کے لیے روانہ ہوئے۔ چکراتے کے راستے میں جونکیں بہت تھیں، میں اور مختار حامد علی آگے نکل آئے تھے، محمود اور بشیر الدین کچھ پیچھے تھے۔ چکراتے کے قریب دیکھا تو مختار حامد علی کا جوتا خون سے سرخ ہو گیا تھا، میرے پاؤں میں بھی ایک جونک لپٹی ہوئی تھی۔ اب فکر ہوئی کہ جلد سے جلد ڈاک بنگلے میں جا کر آرام کریں۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ کلکٹر صاحب دہرہ دون ٹھہرے ہوئے ہیں۔ نام پوچھا تو معلوم ہوا جعفر علی خاں اثر ہیں۔ میں نے اطلاع کرائی کہ ہم لوگ علی گڑھ سے آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ خود بلا لیا۔ میں نے ان سے کہا کہ ہماری پارٹی صرف ایک رات یہاں قیام کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت بارش میں فوجی ڈاک بنگلے جانا مشکل ہے اگر آپ اپنا کھانے کا کمرہ ہمارے لیے دے دیں تو بڑی عنایت ہو۔ انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے ہماری کتھا سنی اور کہا کہ آپ لوگ شوق سے یہاں ٹھہریے۔ مختار صاحب کے زخم دھلوائے، اور ساتھی آ گئے تو سب کو چائے پلوائی۔ اور پھر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ ہم سب پر ان کی بھلمنساہت اور شرافت کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ رات کے کھانے کے بعد انھوں نے اپنا کلام بھی سنایا، یاد آتا ہے کہ غزلوں کے علاوہ ایک ویلش شاعر کے ڈرامے کا ترجمہ بھی سنایا تھا۔ علی گڑھ واپسی کے بعد میں نے انھیں شکریے کا خط لکھا اور پھر کبھی کبھار خط و کتابت ہوتی رہی۔

۱۹۴۶ء میں جب میں لکھنؤ پہنچا تو کشمیری محلے ان سے ملنے گیا اور پھر تو اکثر جانا ہوا۔ وہ بھی کئی دفعہ بیرو روڈ پر اور بعد میں نعمت اللہ روڈ پر میرے یہاں تشریف لائے۔ مشاعروں اور ادبی جلسوں میں بارہا ملنا ہوا۔ ایک دفعہ ہم دونوں حبیب احمد صدیقی کی دعوت پر آگرہ ساتھ گئے۔ غرض دس برس تک اثر صاحب سے خاص قربت رہی، انھیں بہت قریب سے دیکھا اور گھنٹوں ان سے باتیں کیں۔

وہ میری شاعری کی بڑی قدر کرتے تھے، میں نے انھیں بعض غزلیں بھی دکھائی ہیں اور ان کے مفید مشوروں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ پرانے خیال کے تھے مگر ان میں کٹرپن نام کو نہ تھا، مغربی ادب اور عالمی ادب سے خاصے واقف تھے، نئے میلانات پر بھی نظر رکھتے تھے اور اگرچہ زبان کی غلطی اور خیال کی ژولیدگی انھیں بری طرح کھٹکتی تھی مگر جہاں ادبی حسن اور فنکاری انھیں نظر آتی تھی تو دل کھول کر تعریف بھی کرتے تھے۔ یوں وہ عزیز لکھنوی کے

شاگرد تھے مگر شاگرد سے زیادہ دوست ہو گئے تھے۔ ان کا نام بڑی محبت سے لیتے تھے۔ میر کے عاشق ہی نہیں عارف بھی تھے۔ چنانچہ مزامیر کے نام سے انھوں نے میر کا خاصا جامع اور شائستہ انتخاب دو جلدوں میں کیا تھا جو کتابی دنیا دہلی سے چھپا تھا۔ اس پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا تھا وہ ان کی بالغ نظری اور ادبی بصیرت کا بڑا اچھا نمونہ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ غالب نے میر سے بہت فیض اٹھایا ہے اور غالب کے اکثر اچھے اشعار میر کے کسی شعر پر مبنی ہیں۔ اس معاملے میں ان سے اکثر بحث بھی ہو جاتی تھی، مگر وہ اپنی رائے بدلنے کو تیار نہ تھے۔ میر کی عشقیہ شاعری، میر کے یہاں اخلاقی پہلو، میر کے یہاں ہندوستانی فضا، میر کی زبان پر انھوں نے مختلف رسالوں میں کئی عمدہ مضامین لکھے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ میر کی عظمت کو اور مستحکم کرنے میں اثر صاحب کا بھی ہاتھ ہے۔

مطالعۂ غالب، چھان بین اور اثر کے تنقیدی مضامین سے اثر کی زبان دانی پر قدرت، کلاسیکی ادب پر گہری نظر اور ان کی نثر کی حسین تینوں باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ پھر اثر صاحب نے نور اللغات پر جو تنقیدی نظر ڈالی ہے وہ زبان اور اس کے محاورے اور نکات پر ان کی گہری نظر کا ایک اور ثبوت ہے۔ اس سلسلے میں اثر صاحب کی رائے سے ہر جگہ اتفاق ضروری نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کے محاورے اور روزمرہ پر اثر صاحب کی جو نظر تھی وہ نیر صاحب کی بھی نہ تھی۔

یہ واقعہ ہے کہ شاعر کی حیثیت سے بھی اثر صاحب ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے لکھنؤ میں میر کی زبان کو اور فروغ دیا۔ ان کے یہاں تکلف اور تصنع کم ہے واردات قلب کی سچی تصویریں زیادہ۔ جو لوگ تیز و تند جذبات کے ہیجان کو پسند کرتے ہیں وہ اثر صاحب کے کلام کو پھیکا کہہ سکتے ہیں مگر جن کی نظر خیال کی لطافت جذبے کی پاکیزگی اور زبان و بیان کی نزاکتوں پر رہتی ہے وہ اثر صاحب کے کلام میں لطف و کیفیت ضرور محسوس کریں گے۔ ان کے مجموعۂ کلام بہاراں میں بہت سے گل تر مل جاتے ہیں جن کی خوشبو ذہن و دماغ کو معطر کرتی رہتی ہے۔

اثر صاحب مرنجاں مرنج آدمی تھے، لیکن چونکہ خیال کی الجھن اور زبان کی خامی برداشت نہیں کر سکتے تھے اس لیے ان کے بعض شعرا سے معرکے بھی ہوئے لیکن ایک طویل ادبی زندگی میں یہ باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ اثر صاحب کی تنقیدی نظر، ان کی سی کلاسیکل شاعری سے واقفیت، زبان و بیان کی نزاکتوں سے ان کی دلچسپی، ان کی وضع داری، ان کی شرافت اور ملنساہٹ، ان کی سی پاکیزہ شخصیت، اب کہاں نظر آئے گی اور پھر اس کی قدر کرنے والے بھی کب تک رہیں گے۔ نئے دور کی برکتوں کے اعتراف کے باوجود جو قیمتی قدریں وقت نے پامال کر دیں ان کا احساس تو ضروری ہے

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا انتقال

علی گڑھ۔ اردو کے بلند پایہ شاعر، نکتہ رس نقاد، ماہر فن ادیب اور سابق قائم مقام وزیر اعظم کشمیر نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا ۷ جون صبح پانچ بجے اپنے مکان واقع کشمیری محلہ میں طویل علالت اور معذوری کے بعد انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی عمر ۹۲ سال تھی۔ ادب، شعر، تہذیب اور مشرقی روایات کی حامل یہ شخصیت اپنے ساتھ لکھنؤ کے ایک پورے دور کو لے کر رخصت ہو گئی۔

ادارہ ہماری زبان پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

یونیورسٹی اردو ٹیچرز کانفرنس کا سہ روزہ پروگرام

سری نگر۔ کانفرنس کا افتتاح ۲۳ جون کو ۱۰ بجے صبح پرو چانسلر جموں و کشمیر یونیورسٹی جناب خواجہ غلام محمد صادق صاحب فرمائیں گے۔

افتتاحی اجلاس کے بعد کانفرنس شعبوں میں بٹ جائے گی۔

اس سال کانفرنس کے حسب ذیل شعبے ہوں گے

(۱) تحقیق، طریقہ کار، کلاسیکی متن کی تصحیح اور تدوین۔

صدر: ڈاکٹر گیان چند صدر شعبۂ اردو جموں

معتمد: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ریڈر دہلی یونیورسٹی

(۲) اردو زبان کی تدریس اور اردو ذریعۂ تعلیم۔

صدر: ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی

معتمد: ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ریڈر اردو نظام کالج حیدرآباد۔

(۳) اردو میں تراجم کے مسائل

صدر: پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

معتمد: ڈاکٹر ثریا سلطانہ، ریڈر اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۴) غیر زبان والوں اور غیر زبانوں کے علاقوں میں اردو تعلیم کے مسائل

صدر: ڈاکٹر اختر احمد اختر اورینوی صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ۔

معتمد: ڈاکٹر اکبر حیدری استاد اردو امر سنگھ کالج سری نگر

(۵) ۱۹۴۷ء کے بعد اردو ادب میں نئے تجربے اور ان کی معنویت

صدر: پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی

معتمد: ڈاکٹر شکیل الرحمن ریڈر شعبۂ اردو جموں و کشمیر یونیورسٹی

شریک ہونے والے اساتذہ سے درخواست ہے کہ وہ جلد سے جلد پندرہ روپیہ شرکت معتمد ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ریڈر اردو فیکلٹی آف آرٹس (دہلی یونیورسٹی) بتوسط پروفیسر عبدالقادر سروری صدر پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو و فارسی جموں و کشمیر یونیورسٹی امر سنگھ باغ سری نگر کے پتہ پر روانہ فرما کر ریلوے کنسیشن فارم منگوا لیں اور پٹھان کوٹ میں اپنے آمد کی تاریخ سے مطلع فرمائیں۔

(استانی محمد حامدی کشمیری)

ذکا صدیقی،

تصحیح و توضیح

تصحیح

۲۲ر اپریل ۷۰ء کے 'ہماری زبان' میں میرا ایک مراسلہ "وزن یا بحر؟" کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔ قارئین کرام سے گزارش ہے کہ آخری سطروں کی پوری عبارت حسب ذیل پڑھی جائے۔

"فعل بہ سکون لام یا بہ تحریک لام بہر صورت یہاں بے جا ہے گمان غالب ہے کہ یہ سہو کتابت ہے۔ جس طرح "بڑھا بڑھا" کے نیچے "فعلن فعلن" لکھا گیا ہے، "پتا پتا" کے تحت بھی فعل فعل کی بجائے "فعلن فعلن" ہوگا۔"

(۱)

۱۵ر دسمبر ۱۹۶۹ء کے "ہماری زبان" میں سردار جعفری کی ایک ساقط الوزن غزل" کے عنوان سے محترمہ انجم آرا انجم، ریسرچ اسکالر کا مراسلہ شایع ہوا ہے۔ اس میں موصوفہ نے سردار جعفری کی غزل جس کا مطلع ہے۔

وہی ہے وحشت، وہی ہے نفرت آخر اس کا کیا ہے سبب
انساں انساں بہت رٹا ہے انساں انساں ہے کا کب

کے سات شعر نقل کرکے اس پر ساقط الوزن ہونے کا اعتراض کیا ہے۔ اسی ہفتہ وار اخبار کی ۲۲ر مارچ ۷۰ء کی اشاعت میں حضرت شفا گوالیاری کا مراسلہ اس اعتراض کے جواب میں شایع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے، "کیا واقعی سردار جعفری کی غزل ساقط الوزن ہے" ذیل کے مضمون میں اعتراض و جواب پر مختصر تبصرہ کرکے اصولی بحث کی گئی ہے۔

محترمہ انجم صاحبہ نے زحمت فرماکر سردار جعفری کی غزل کے ہر مصرع کی تقطیع کی ہے اور درست کی ہے۔ ان کی یہ کاوش قابل داد ہے۔ مگر اعتراض میں نہ عروضیوں کا سا منطقی انداز بیان ہے نہ محققوں کا سا محققانہ حزم و احتیاط۔ اگر جرح کے ساتھ ساتھ شاعر معترض علیہ کی جانب سے بھی کچھ تلاش و جستجو کی ہوتی تو اعتراض کی نوبت ہی نہ آتی حضرت شفا گوالیاری نے بھی شاعر کی حمایت میں وہی انداز بیان اختیار کیا بات معقول کہی مگر انداز گفتگو نے مسئلہ کو حل کرنے کی بجائے نئی نئی الجھنیں پیدا کر دیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے۔

محترمہ انجم صاحبہ کے اعتراض کی عبارت ہے "اس غزل میں زیادہ تر ارکان بحر متقارب کے استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن اصولی طور پر اس بحر کے ارکان شاعر برقرار نہیں رکھ سکا ہے اس غزل کا ہر مصرع دوسرے مصرعوں سے ارکان کی ترتیب میں جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اس لیے پوری غزل مجوزہ اصول و فن عروض کے تحت نہ ہونے کے باعث ساقط الوزن کہے جانے کی مستحق ہے۔" محترمہ موصوفہ کے اعتراض کی ابتدا ہی غیر عروضی انداز بیان میں ہوئی ہے۔ پہلے بحر متقارب کی اصل "فعولن" کا ذکر کیا جاتا۔ پھر ارکان کی بجائے مزاحفات یا فروع لکھا جاتا تو بہتر ہوتا: زیادہ تر، مبہم بات ہے۔ تقطیع خود کی ہے۔ لگے ہاتھ بتا دیا جاتا کہ فعولن، رکن سالم کے علاوہ اس کی پانچ فروع،

فعولُ، فعلن، فعَل، فع، فاع

آئی گئی ہیں۔ اصل اعتراض میں "مجوزہ اصول" کا فقرہ تو لکھ دیا۔ مگر یہ نہ بتایا کہ وہ اصول کیا ہیں کس نے تجویز پیش کی تھی کس نے تائید کی تھی۔ اسناد کا نام نشان نہیں۔ جداگانہ حیثیت، اصل بنائے فساد ہے۔ "حیثیت" واقعتاً درست سہی عروضیوں کی زبان نہیں۔ "حیثیت" کی جگہ "وزن" ہوتا تو خود موصوفہ پر منکشف ہو جاتا کہ اس غزل میں سقوط وزن نہیں ہے کثرت اوزان ہے۔ اس انکشاف کے بعد یہ تلاش کیا جاتا کہ ایک ہی غزل میں اس کثرت سے اختلاف اوزان جائز ہے یا ناجائز۔ اب اساتذہ کے مصرعوں پر نظر ڈالی جاتی اور ماہرین عروض کے اقوال سے استناد کی جستجو کی جاتی۔ یہ تھا تحقیق کا سیدھا راستہ۔ موصوفہ ماشاء اللہ ریسرچ اسکالر ہیں ان سے مودبانہ عرض ہے کہ پوری غزل کی تقطیع کرکے مستحسن اقدام کیا تھا تو اسی راہ پر گامزن رہتیں۔ اعتراض کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیا جاتا۔ بحث کے آخر میں یہ لکھنا "سردار جعفری جیسے عظیم المرتبت شاعر سے ہرگز یہ امید نہ تھی کہ وہ اس بحر میں ایسے ایسے غوطے کھائیں گے۔" منافرانہ انداز گفتگو ہے محقق کو زیب نہیں دیتا۔

(۲)

حضرت شفا گوالیاری نے اپنے مراسلے میں انجم صاحبہ کو چیلنج دیا ہے فرماتے ہیں:

"انجم صاحبہ کوئی ایسی مثال عنایت فرمائیں کہ بحر متقارب کی ایسی کوئی غزل ہو جس میں مختلف زحافات کا عمل ہو اور یکساں ارکان اور ترتیب قائم رہی ہو۔" معلوم نہیں یہ چیلنج قبول کیا گیا یا رد ہوا۔ یہاں میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ یہ عمل عامۃ الورود ہے "بطریق شاذ نہیں فارسی اور اردو کے ہر شاعر کا مبتدی ہو یا منتہی، صف اول کا ہو یا صف نعال کا بحر متقارب ہی نہیں ہر بحر میں یہی معمول رہا ہے۔ غزل کے ہر مصرع میں مختلف مزاحفات یکساں ترتیب سے آتے ہیں اور پوری غزل میں اس یکسانیت اور ترتیب کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ ہم اسی کے خوگر ہیں اس معمول کے خلاف جہاں زحافات میں تغیر ہوا، علی الخصوص بیت کے اوساط مصرعین میں اور ٹھیکا بدلا ایک دھچکا سا لگتا ہے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ سامع یا قاری ماہر عروض تو ہوتا نہیں چونکنے لگتا ہے شاعر نے پٹری بدل دی۔ سکتہ ہے۔ وزن میں ناہمواری ہے۔ ساقط الوزن ہے۔ یکسانیت اور ترتیب موجود نہ ہونے کے جواز میں سند کے طور پر حضرت شفا گوالیاری نے میر تقی کی مشہور غزل کا ایک شعر اور یگانہ چنگیزی کی غزل کے دو شعر پیش کئے ہیں اور تقطیع کرکے ناہمواری ظاہر کی ہے۔ یہ اسناد بالکل درست ہے۔

(۳)

۸ رمئی ۱۹۷۷ء "ہماری زبان" میں دور آفریدی صاحب کا مراسلہ "سردار جعفری کی ایک غزل کے وزن کا مسئلہ" شایع ہوا ہے موصوف نے پریشاں خیالی کی حد کردی۔ انجم صاحبہ کی بیان کردہ تقطیع کو غلط بتایا ہے اور اپنی طرف سے تقطیع پیش کی ہے اور اس میں عروضیوں کی رسم ورواج سے ناواقفیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ تقطیع میں حروف ملفوظ کا شمار کیا جاتا ہے اور حروف مکتوبہ غیر ملفوظ کو تقطیع کے واسطے لکھنے میں نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ مثلاً "ہے" میں اگر "ے" پوری تلفظ میں آتی ہے تو تحریر میں بھی باقی رکھی جاتی ہے ورنہ صرف ایک "ہ" متحرک لکھی جاتی ہے تاکہ وزن کے مطابق پڑھی جائے۔ اسی طرح "کیا" صرف ایک سبب خفیف ہو تو تقطیع کرتے وقت "کا" لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح تقطیع کے لیے طریق کتابت کے برخلاف ایک علیحدہ شکل اختیار کرلیا ہے انجم صاحبہ نے اس کا خاص لحاظ رکھا ہے مگر دور صاحب نے عروضیوں کے اس معمول کو قطعاً نظر انداز کردیا ہے۔

اس بنیادی غلطی کی وجہ سے خود صحیح تقطیع کرنے سے قاصر رہے اور انجم صاحبہ کی صحیح تقطیع کو غلط سمجھ لیا۔ انھوں نے پہلے مصرعہ کے جزو آخر "یہ! کیا ہے سبب" کے نیچے "فعلن فاع" لکھا ہے۔ یہ سراسر غلط ہے۔ انجم صاحبہ نے اس کی تقطیع "فعل فعل" سے کی تھی۔ اسی طرح "بنے گا کب" دوسرے مصرع کا آخری جزو ہے۔ اس کے نیچے بھی "فعلن فاع" دور صاحب نے لکھا ہے۔ اس کی تقطیع انجم صاحبہ نے "بنے گ کب" لکھ کر "فعول فع" کی تھی۔ دور صاحب نے "بنیگ اکب" لکھا ہے۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ "اَب" میں "ا" کاتب صاحب کا تصرف ہے، تب بھی اس کی تقطیع "فعلن فاع" سے نہیں ہو سکتی۔ "فاع" کسی حال میں نہیں ہو سکتا۔

شفا صاحب نے میر کے شعر "پتا پتا بوٹا بوٹا" الخ میں تقطیع کا صحیح طرز کتابت اختیار نہیں کیا لیکن دوسرے مصرع کی تقطیع بالکل صحیح کی ہے۔ اس کے برخلاف دور صاحب کا نہ طریق کتابت درست ہے نہ تقطیع۔ انھوں نے دوسرے مصرع کی تقطیع یوں کی ہے۔

جانے نجانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فع

عروضیوں کے معمول کتابت کا تتبع کرنے کی بجائے سخت غیر عروضی انداز بیان میں پانچ سطر کی ایک بہت ہی الجھی ہوئی عبارت تحریر فرمادی ہے۔ مگر تقطیع میں جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ یہاں تو کم سے کم اجزائے بیت کے نیچے صحیح مزاحفات لکھے ہوتے!!

شفا صاحب کا ایک قول نقل کرکے دور صاحب فرماتے ہیں:

"شفا صاحب کے اس بیان کو صاد ور اکذا۔ ؟" کیا جاتا ہے (یعنی بحر متقارب نے آٹھ بحروں کو جنم دیا ہے) "یہ جنم دینا" بہت ہی مکروہ کنایہ ہے۔ خلیل ابن احمد نے اپنے پیش رو شعرائے عرب کا کلام سامنے رکھ کر بحریں ایجاد کیں۔ ابوالحسن اخفش نے ان میں بحر متدارک کا اضافہ کیا یہ کل ملاکر سولہ سترہ ہوئیں۔ ان میں سے فارسی میں صرف دس رائج ہیں۔ اردو میں بھی یہی ہیں۔ غرض بحریں جتنی تھیں اتنی ہی ہیں۔ ان میں اختلاط باہمی سے توالد وتناسل کا سلسلہ کبھی نہیں چلا۔

(۴)

محترمہ انجم صاحبہ ہوں یا حضرت شفا گوالیاری یا جناب دور آفریدی سب نے عروضی مصطلحات کو گڈمڈ کرکے عبارت آرائی کی ہے۔ رکن، بحر، وزن، زحاف کا جو مفہوم عروضیوں نے مقرر کیا ہے اس کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا اسی وجہ سے یہ کاوش بیانات ہیں خود الجھن میں گرفتار ہیں۔ "ہماری زبان" کو بھی الجھن میں ڈالا ہے۔

سردار جعفری کی غزل پر اعتراض کی اصل بنا یہ ہے کہ ایک ہی غزل کا ہر مصرع ایک علیحدہ وزن میں نظر آتا ہے۔ نہ مزاحفات یکساں ہیں نہ ان کی ترتیب ہموار۔ اس کیفیت کو پیش نظر رکھ کر یہ سوال کیا جاتا کہ آیا یہ تنوع مزاحفات اور اختلاف ترتیب جائز ہے یا ناجائز اور اساتذۂ عروض کے اقوال اور شعرائے مستند کے معمولات سے استشہاد کیا جاتا۔ حضرت شفا گوالیاری نے جواز کی سند میں میر اور یگانہ کے شعر پیش کیے دور آفریدی صاحب سے میر کو ناقابل استناد قرار دینے کی جراءت تو نہ ہو سکی، مرحوم یگانہ چنگیزی کو ہدف ملامت بنایا۔ ان کو غالباً یہ نہیں معلوم کہ مرحوم مرزا یگانہ چنگیزی جید ماہر عروض تھے انھوں نے اس میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں عروض پر اپنی تصنیف "چراغ سخن" (مطبوعہ مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۹۲۱ء) میں ان سے بعض معرکوں کا ذکر کیا ہے۔ دور صاحب سے صرف اتنا کہتا ہوں۔

عندلیب بحر بیکراں زدہ ای

علامہ نیاز فتح پوری

سعادت نظیر

کیا کوئی سحر ہے، افسوں ہے موت؟
ایک کیفیتِ سکوں ہے موت
خوابِ بیداری جنوں ہے موت؟
موت تجدیدِ زندگانی ہے
وقفۂ عہدِ جاودانی ہے

آسمانِ ادب کے اے خورشید
حسنِ تخلیق ہے تری تنقید
تیری ہستی ہے زندۂ جاوید
تیرے نقشِ قلم سے ابھرے ہیں
جو ہنر کے نجوم بکھرے ہیں

تو کہ تھا عہدِ آخریں فنکار
صاحبِ طرزِ دل نشیں فنکار
دیدہ ور اور نکتہ بیں فنکار
تجھ کو روشن دماغ کہتے تھے
انجمن کا چراغ کہتے تھے

خوش بیاں خوش نظر ادیب نیاز
اور تحریر کا نیا انداز
آہ، وہ تیرے خیال کی پرواز!
بانکپن جس طرح غزل کا ہو
رنگ کھلتے ہوئے کنول کا ہو

اے مفکر، حیات کے نقاد
ذوقِ تحقیق و قوتِ ایجاد
تو نے پائی تھی فطرتِ آزاد
فکر و جذبہ کو امتزاج دیا
اور ادب کو نیا مزاج دیا

تیرے موضوعِ فکر کے عنوان
زندگی، کائنات اور انسان
فلسفہ، شعر، تجربہ، وجدان
ان میں تو نے کمال دکھلایا
اپنا ذوقِ جمال دکھلایا

تیری تخلیق، تیرے شہپارے
سینۂ شوق کے ہیں انگارے
حسن کاری کے ہیں حسیں تارے
اب کوئی تجھ سا حسن کار نہیں
یعنی یکتائے روزگار نہیں

اف وہ تیرا یقیں ترا ایمان
جس کا اک عکس ہے "من یزداں"
تیرا ادراک، آگہی، عرفاں
ہے بجا تجھ کو "حق تلاش" کہیں
زندگی کا صنم تراش کہیں

"سرگزشتِ شباب" کی تمثیل
ہر فسانہ ترا ہے نقشِ جمیل
تیرے خوابِ حسیں کی ہے تکمیل
تو کہ "محمود" بھی تھا "آذر" بھی
بت شکن بھی تھا اور بت گر بھی

تیرے فکر و نظر کا عکس "نگار"
روشنی ادب کا ایک منار
تیرے ذوقِ سلیم کا شہکار
حوصلوں کی ترے امانت ہے
تیری عظمت کی اک ضمانت ہے

رباعی

ثریا صابر

جذبات سے اس درجہ تعشق کیا ہے؟
اس ضد کا حقائق سے تعلق کیا ہے؟
مذہب سے زبانوں کو نہ منسوب کرو
مذہب کا زبانوں سے تعلق کیا ہے؟

غزلیں

علی عباس امید

رات ڈھلتی ہے تو پھر اس کو گنہگار کہو
دن نکل آئے تو سورج کو خطا کار کہو

زندگی ختم ہو لفظوں کے نقابوں میں مگر
لفظ مل جائیں تو پھر ان کو سرِ دار کہو

آئینہ خانۂ تصویر ہیں سب دشت و دمن
ابنِ آدم ہی کو اب دہر کا معمار کہو

بے سکوں روح ہے اک جسم میں پوشیدہ ہے
ان کلیوں کا جو چٹخنے پہ اداکار کہو

وقت کے رتھ پہ رواں راحتِ بیدار ابھی
ہاتھ آئے تو اسے دولتِ بیکار کہو

تند آندھی نے بجھائے ہیں جو خوابوں کے دیئے
غم کی راتوں میں انھیں مونس و غمخوار کہو

اک نیا زخم لگا جاتی ہے جو دل پہ یاد
ایسی ہر یاد کو تم باعثِ آزار کہو

میرا ہر شعر ہے اک لائحۂ فکر و عمل
میری غزلوں کو نئے دور کا معیار کہو

زندگی منتِ اربابِ ستم ہے امید
آدمی کو غم و آلام کا رہوار کہو

شاہد عزیز

دل کی ہر بات بتاؤ نہ بہت رات گئے
اپنے زخموں کو جگاؤ نہ بہت رات گئے
میرے گیتوں میں مرے غم کے سوا کچھ بھی نہیں
تم مرے گیت سناؤ نہ بہت رات گئے
اپنے ارمان جلائے ہوئے مدت گزری
پھر کوئی خواب دکھاؤ نہ بہت رات گئے
میں سمجھ سکتا ہوں ان کانپتے ہونٹوں کے سوال
تم کوئی بات چھپاؤ نہ بہت رات گئے
میں نے گیتوں میں چھپا رکھی ہے تصویرِ سحر
تم کوئی گیت جلاؤ نہ بہت رات گئے
ان اندھیروں کو اجالے کی تمنا کب ہے؟
تم کوئی دیپ جلاؤ نہ بہت رات گئے
دل کے ٹوٹے ہوئے تاروں سے نہ نکلے گی صدا
تم کوئی ساز اٹھاؤ نہ بہت رات گئے

عظیم حیدرآبادی

دل شکن ان کی ادا یاد تو ہے
وہ سجے مائل بہ کرم یاد نہیں
گھر سے بے گھر ہوئے کیا کیا نہ ہوا
ہائے تغیرِ الم یاد نہیں
دامنِ ضبط کا کیا حشر ہوا
دیکھ کر روئے صنم یاد نہیں
تھے کبھی ہم بھی زمانہ میں عظیم
نازِ پروردۂ غم یاد نہیں

امام مرتضیٰ نقوی

ہندستان میں کتب خانوں کی تحریک اور اس کا ارتقاء

کتب خانہ یا لائبریری ایک ایسا ادارہ ہے جہاں انسانی خیالات، تجربات اور مشاہدات کتابی شکل میں محفوظ کیے جاتے ہیں جہاں ایک شخص کے خیالات سے سیکڑوں اشخاص استفادہ کرتے ہیں جہاں ایک شمع سے سیکڑوں شمعیں روشن کی جاتی ہیں۔

کاغذ کی ایجاد سے پہلے کتب خانوں کا خیال انسان کے ذہن میں آیا بھی نہ تھا۔ لیکن کاغذ کی ایجاد نے دنیا میں ایک نئی روح پھونک دی سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں کتابیں لکھی جانے لگیں، مگر وہ سب کتابیں قلمی تھیں انھیں لکھنے کے لیے وقت کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے پریس کی ایجاد ہوئی جس نے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ ذخیرہ فراہم کیا۔

پہلے زمانے میں لائبریری کا تخیل وہ نہیں تھا جو اب ہے وہ اس سے ذرا مختلف تھا۔ کتابوں کا مقصد آئندہ نسلوں کے لیے کتابوں کو محفوظ کرنا تھا۔ نہ کہ ان کا مطالعہ کرنا اور ان سے استفادہ کرنا پھر کچھ عرصے کے بعد اس خیال میں کچھ تبدیلی پیدا ہوئی۔ کتابیں مطالعہ کے لیے کتب خانوں میں رکھی جانے لگیں۔ مگر وہ کتب خانے عوام کے لیے نہیں تھے۔ وہ خواص کے کتب خانے تھے۔ وہ شہنشاہوں اور بادشاہوں کے کتب خانے تھے۔ جہاں عوام میں سے کسی کا گذر بھی وہاں نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ان کی ذاتی ملکیت تھے۔ اس کے علاوہ مندروں اور دیگر مذہبی مقامات پر چھوٹے چھوٹے کتب خانے بننے لگے۔ جو عوام کے لیے تھے جن میں صرف مذہبی کتابیں ہوا کرتی تھیں بڑے بڑے مدرسوں اور کالجوں میں بڑے بڑے کتب خانے ہونے لگے جہاں کالج کے ہزاروں طلبہ مطالعہ کرتے تھے ہندستان میں کتب خانوں کی تاریخ کافی پرانی ہے نالندہ کا کتب خانہ اتنا بڑا تھا جو اپنی درسگاہ کے ڈیڑھ ہزار اساتذہ اور نو ہزار طلبہ کی علمی ضرورتوں پوری کرنے کے علاوہ بیرونِ ہند کے لوگوں کو بھی فیض پہنچاتا تھا۔ مسلمانوں کے ہندستان آنے کے بعد بھی جوں جوں علمی سرگرمیاں بڑھتی رہیں کتب خانوں میں بھی خاطر خواہ ترقی ہوتی رہی۔ مغل بادشاہوں نے اپنے علمی ذوق و شوق سے بڑے بڑے کتب خانے قائم کیے۔

سلطان جلال الدین نے اپنے محل میں ایک کتب خانہ کھولا اور امیر خسرو کو اس کا لائبریرین یا مہتمم مقرر کیا۔ دورِ جدید میں ریاستوں نے بھی بڑے بڑے کتب خانے قائم کیے۔ جیسے حیدر آباد، رامپور اور بھوپال میں۔

مگر یہ سب کتب خانے اپنا ایک خاص روایتی انداز لیے ہوئے تھے۔ ۱۸۵۰ء تک جبکہ مغلیہ سلطنت ختم ہو رہی تھی ایک قسم کا جمود نظر آتا ہے۔ لیکن ۱۸۶۷ء کے بعد جبکہ پریس اور رجسٹریشن ایکٹ منظور ہوا تو کتب خانوں کی تحریک باقاعدہ طور پر شروع ہوئی۔ اس ایکٹ کا یہ مقصد تھا کہ ناشر کو چاہیے کہ وہ کتاب شائع ہوتے ہی اس کی ایک کاپی نیشنل لائبریری کو بھیجے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ملک میں کتنی کتابیں چھپی ہیں۔ ۱۹۰۰ء میں کلکتہ کی امپیریل لائبریری کو نیشنل لائبریری تسلیم کر لیا گیا۔

۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۱ء تک بڑودہ کے راجہ سیاجی راؤ نے لائبریری کی تحریک میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیا۔ انھوں نے امریکہ سے ڈبلیو۔ سی بورڈن کو بلایا یہ شخص لائبریری کے انتظام میں اچھی مہارت رکھتا تھا۔ اس نے بڑودہ میں لائبریری کو بڑی اچھی طرح ترتیب دیا، تاکہ ہر شخص آسانی سے استفادہ کر سکے۔

۱۹۱۴ء میں آندھرا لائبریری ایسوسی ایشن" کی بنیاد پڑی۔ اس ایسوسی ایشن نے لائبریری سے متعلق ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ اور ایک بحری لائبریری بھی ایجاد کی۔ جو دریا کے کنارے رہنے والے لوگوں کو کتابوں کی سہولتیں دیتی تھی۔ آندھرا لائبریری ایکٹ ۱۹۶۰ء میں منظور ہوا ہے۔

۱۹۲۳ء میں مسٹر دیو جیا شے نے بنگال میں ایک لائبریری ایسوسی ایشن قائم کی۔ اس ایسوسی ایشن نے لائبریری کی تحریک میں کافی دلچسپی لی۔

لاہور میں بھی ایک دوسرے امریکن مسٹر ڈکنسن نے لائبریری کی اصلاح و ترقی میں بڑی محنت سے کام کیا۔ انھوں نے وہاں کی کتابوں کو ترتیب دیا۔ اور لائبریری سے متعلق ایک کتاب بھی لکھی۔ جس میں لائبریری سائنس کے چند اصول اور قواعد مرتب کئے۔ پنجاب میں منت رام جاتیہ جو وہاں کی ایک نامور شخصیت تھے اس میں دلچسپی لی۔ اور انھوں نے ایک رسالہ "ماڈرن لائبریرین" کے نام سے جاری کیا۔

۱۹۴۸ء میں جب ہندستان آزاد ہوا تو مدراس پبلک لائبریری ایکٹ منظور ہوا۔ مدراس کی ایک نامور شخصیت ڈاکٹر رنگا ناتھن جن کو ہندوستان میں لائبریری سائنس کا باپ کہا جاتا ہے انھوں نے اس تحریک میں سب سے نمایاں حصہ لیا مدراس ایکٹ کے پاس ہونے کے بعد وہاں دیہاتوں اور شہروں میں کتب خانوں کا جال پھیل گیا۔

مسٹر کے۔ بی اسد اللہ نے " لائبریری ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی شروع میں لوگوں نے اس میں کافی دلچسپی لی۔ مگر درمیان میں اس میں ایک قسم کا جمود پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد اس میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ اور لوگ پہلے ہی کی طرح اس میں دلچسپی لینے لگے۔

۱۹۵۲ء میں" انڈین نیشنل سائنٹفک ڈاکومنٹیشن سنٹر" کا قیام عمل میں آیا یہ ادارہ دہلی میں یونیسکو کی مدد سے بنایا گیا۔ اس کا مقصد کتابیات یا ببلوگرافی کو تاریخی شکل دینا ہے۔ یہاں مختلف زبانوں سے ترجمہ وغیرہ کا کام بھی ہوتا ہے سائنس اور لائبریری

سائنس سے متعلق جو مضامین رسالوں میں شایع ہوتے ہیں ان کی درجہ بندی (CLASSFIED) ترتیب کی ایک فہرست بھی تیار ہوتی ہے۔

۱۹۵۵ء میں یونیسکو نے دہلی پبلک لائبریری کے قیام کے لیے ایک منصوبہ بنایا اور اس سلسلہ میں ایجوکیشن منسٹری نے اس کی معاونت کی۔ اس کی مدد سے دہلی میں سب سے بڑی پبلک لائبریری وجود میں آئی۔ اس کا شمار دہلی ہی میں نہیں بلکہ ایشیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں ہے۔ اس کی اپنی بہت سی شاخیں بھی ہیں۔ گشتی لائبریریاں بھی ہیں۔ تاکہ دہلی اور اس کے گرد و نواح کے رہنے والوں کو پڑھنے کے لیے سہولتیں فراہم کرے۔ اس میں بچوں کے پڑھنے کے لیے بھی علیحدہ انتظام ہے اور اندھوں کے لیے بھی ایک خاص قسم کی کتابیں ملتی ہیں۔ یہاں مختلف موضوعات پر تقریریں اور مباحثے بھی ہوتے رہتے ہیں۔

۱۹۵۸ء میں ایجوکیشن منسٹری نے ایک کمیٹی کا تقرر کیا تاکہ وہ ہندوستان کی لائبریریوں۔ ان کے معیار۔ اسٹاف اور تنخواہوں کا ایک خاکہ تیار کرے اور لائبریریوں کے کاموں پر توجہ دے۔

لائبریریوں کی اس ترقی کو دیکھتے ہوئے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کے انتظام اور ترتیب کے لیے تربیت یافتہ یا ٹرینڈ لائبریرین ہونے چاہئیں اس سلسلے میں ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں نے دو قسم کے کورس قائم کیے ایک ابتدائی کورس جس کو سرٹیفکٹ کورس کہتے ہیں جس کی مدت چار سے چھ ماہ ہوتی ہے دوسرا ڈپلوما جو ایک سال کا کورس ہے۔ سرٹیفکٹ کورس ہائی اسکول پاس شدہ طلبہ کے لیے ہے اور ڈپلوما گریجویشن کے بعد ہوتا ہے۔ علی گڑھ بنارس۔ دہلی۔ جے پور چنڈی گڑھ اور مدراس وغیرہ کی یونیورسٹیوں نے اس کورس کو پڑھانے کا انتظام کیا ہے دہلی یونیورسٹی نے ڈپلوما کے بعد ایم لب کے نام سے ایک کورس جاری کیا ہے یہ ہندوستان میں لائبریری سائنس کا سب سے بڑا کورس ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جارہا ہے تاکہ ہندوستان کی بڑی بڑی لائبریریوں کا انتظام کرنے کے لیے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ لائبریرین بھی ہوں۔

دسمبر ۱۹۶۴ء میں میسور بل پیش کیا گیا جو ۱۹۶۵ء میں منظور ہو گیا اور میسور میں باقاعدہ طور پر لائبریری کی اصلاح و ترقی کے لیے کام شروع ہو گیا۔

کتب خانوں یا لائبریریوں میں پڑھنے والوں کے مذاق کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے جس طرح پڑھنے والے عام اور خاص ہوتے ہیں اسی طرح لائبریریاں بھی عام اور خاص ہوتی ہے۔ ان میں کتابیں قارئین کے مذاق کے مطابق ہوتی ہیں۔ عام طور پر پبلک لائبریریوں میں جو کتابیں ہوں گی ان میں زیادہ زور عام فہم کتابوں پر دیا جائے گا محض علمی اور ٹکنیکل کتابوں سے عوام کو دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس لیے وہاں ناول اور معلومات عامہ کی کتابیں ہی عوام کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوں گی۔ جس سے ان کے اندر پڑھنے کا شوق پیدا ہو۔ ہندوستان کے جن شہروں میں پبلک لائبریریاں ہیں وہاں اسی قسم کا لٹریچر زیادہ ملتا ہے۔

اس کے علاوہ ہر فن پر علیحدہ علیحدہ لائبریریاں بھی ہوتی ہیں وہاں کتابیں بھی اسی فن کی ہوتی ہیں پڑھنے والے بھی اسی فن سے متعلق آتے ہیں اسٹاف بھی اس فن سے واقفیت رکھتا ہے۔ اس قسم کی لائبریریاں بہت سی ہیں۔ انجینیرنگ۔ میڈیکل۔ ٹکنالوجی۔ معاشیات تاریخ ادب اور اسلامیات پر لائبریریاں قائم کی جا رہی ہیں۔

اس عرصے میں لائبریری سائنس سے متعلق ادب میں بھی کافی لکھا گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں کتابیں اور مضامین شایع ہو چکے ہیں ڈاکٹر رنگا ناتھن تقریباً پچاس کتابیں اور ایک ہزار مضامین لائبریری سائنس پر لکھ چکے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر رنگا ناتھن کا سب سے اہم کام "کولن کلاسیفکیشن" ہے جس میں انھوں نے ہر فن کی سائنسی نقطۂ نظر سے درجہ بندی کی ہے اگرچہ پہلے اور اب بھی بہت سی لائبریریوں میں امریکہ کی ایک درجہ بندی کی اسکیم "ڈیوی ڈسمل کلاسیفکیشن" جاری ہے مگر رنگا ناتھن کی اس اسکیم نے ہندوستان میں کافی مقبولیت حاصل کر لی۔ اور بڑی بڑی لائبریریوں جیسے دہلی یونیورسٹی کی لائبریری نے اس کو اپنا لیا ہے وہاں پر کتابوں کی ترتیب اس کے تحت کی جاتی ہے۔ فنون کی درجہ بندی کے علاوہ ڈاکٹر رنگا ناتھن نے کیٹلاگ سازی کے بھی بہت سے اصول اور قواعد مرتب کیے ہیں۔ انھوں نے لائبریری سائنس سے متعلق کوئی گوشہ نہیں چھوڑا جس پر انھوں نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔

اسلامیات اور مشرقی ادب وغیرہ کی درجہ بندی اور کیٹلاگ سازی کے سلسلے میں اب تک توجہ نہیں دی گئی تھی۔ لیکن سید محمود الحسن قیصر نے اس طرف توجہ کی۔ انھوں نے اسلامی علوم اور اردو فارسی اور عربی ادب کو ڈیوی ڈسمل کلاسیفکیشن کی بنیاد پر آگے بڑھایا اور ان کی توسیع کی۔ اور ان علوم کی ترتیب میں سہولت بہم پہنچائی ان کی یہ اسکیم یا درجہ بندی کا خاکہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ۱۹۶۵ء میں شایع کیا ہے۔

مراسلہ

چھوٹا منہ بڑی بات

اردو میری اکتسابی زبان ہے۔ بنابریں مادری زبان والوں کی طرح سے بڑ ہانکنا مجھے زیب نہیں دیتا۔ مزید بریں مجھے من المہد الی اللحد علم حاصل کرنا ہے اس لیے اہل علم کو کریدتا رہتا ہوں۔

عالی جناب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا ایک مضمون بصورت فتویٰ یکم مئی ۱۹۹۷ء کے شمارے میں بعنوان "ہمزہ کیوں؟" زیر نظر آیا تو عبارت کے گورکھ دھندے میں ذہن الجھ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد "صوتیات کی مدد سے ہمزہ کا صحیح منصب معلوم کیا جائے اور اردو رسم الخط کی سطح پر اس کے استعمال کے اصولوں اور حدود کا پتہ چلایا جائے" اس مضمون میں مقصد میری دانست میں تشنۂ تشریح رہ گیا ہے۔

ہمزہ یا ہمزہ یا الف۔ عربی حروف تہجی سے مستعار لیا گیا ہے کہ اردو کی لسانی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ اردو کے حروف تہجی ب۔ پ۔ ت۔ ٹ۔ ث۔ ج وغیرہ سب کے سب اپنے پہلے حرف کے ساتھ اپنے مسمّیٰ کی اصلی آواز کا پتہ دیتے ہیں مثلاً ب سے بکری پ سے پنکھا۔ ٹ سے ٹکڑا اور ث سے ثاقب وغیرہ لیکن ہمزہ کو بقول عالی جناب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ "علامت بے صوت" کہا جاتا ہے۔ میرے لیے یہ توجیہہ قابل پذیرائی نہیں۔

ہمزہ حروف تہجی عربی کا پہلا حرف ہے جس کی اصل اَمزہ ہے۔ عربی حروف تہجی میں بہ ترتیب ابتث اَمزہ کی نشست ہائے ہوز کے بعد ہے۔ ہائے ہوز اور اَمزہ کے مخرج قریب تر ہیں۔ چنانچہ تدریس میں ہ و یعنی ہے اَمزہ سے اُمزہ رشتے ہائے ہوز کی ہے اَمزہ میں مدغم ہو گئی اور زبانوں پر ہمزہ چڑھ گیا پھر اسی طور سے بولا جانے لگا۔

ہمزہ کی کوئی خاص علامت نہ تھی الف متحرک ہمزہ کا کام دیتا تھا۔ چونکہ اس کا استعمال مختلف صورتوں میں ہوتا تھا اس لیے اہل نحو نے الف سے امتیاز ثابت کرنے کے لیے ہمزہ کو ء کی شکل دے دی۔ لیکن صوت الف متحرک ہی کی رہی یعنی ہمزہ کو جھٹکے کے ساتھ پڑھا جاتا ہے حروف علت واؤ یا یائے کے ساتھ آنے میں ہمزہ ان حروف کی صوت کو جھٹکا دے دیتا ہے۔ ہمزہ جب ابتدائے لفظ میں واقع ہو تو الف (ا) (رکھو مستقیم) کی شکل میں آتا ہے۔ مثلاً ابر۔ اصل۔ اجل اور احد وغیرہ اگر اصل ہمزہ سے پہلے کوئی حرف آ جائے تو صورت صوت نہیں بدلتی مثلاً لگا ابر، بر اصل۔ بے اجل اور الشد احد۔

ہمزہ وسط لفظ میں واقع ہو تو اس حرف کی صوت پیدا کرتا ہے جو ما قبل حرکت ما قبل ہو یعنی زبر کے بعد الف پیش کے بعد واؤ اور زیر کے بعد یائے کی صورت میں مثلاً جرأت۔ مؤثر۔ ہیئت وغیرہ لیکن سب میں صوت جھٹکے کے ساتھ رہتی ہے۔

ہمزہ کو عرف میں الف ہی کہا جاتا ہے اور ہمزہ اور الف میں بس یہی فرق ہے کہ الف ہمیشہ ساکن ہوتا ہے اور کھینچ کر پڑھا جاتا ہے مثلاً عالم، حساب وغیرہ میں اور ہمزہ متحرک ہو یا ساکن جھٹکے کے ساتھ پڑھا جاتا ہے چنانچہ اردو والوں نے بھی ہمزہ کی اس خصوصیت کو برقرار رکھا اور ہمزہ جھٹکے کے ساتھ استعمال میں رہا۔ جرأت، ہیئت۔ فائدہ ایسے الفاظ بطور شہادت ہیں۔ عالی جناب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا فرمان ہے "یائے مجہول اور معروف پر ختم ہونے والے افعال کا معاملہ برعکس ہے۔ ان کی تصریفی صورتوں میں ہمزہ کا استعمال نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ان میں جہاں جہاں نیم مصوتہ یائے آیا ہے اس سے پہلے 'آئی' (i) یعنی کسرہ ہے اور اس صوتی ماحول میں نیم مصوتہ (y) اپنی آواز برقرار رکھتا ہے چنانچہ ان الفاظ کا صحیح املا نیم مصوتہ یائے (y) ہی سے ہے مثلاً پییں، پیو، پیے، پیاہ۔

جہاں تک میرا مطالعہ ساتھ دیتا ہے اہل نحو نے اس محل پر ء بطور یائے مقصورہ کو رواج دیا تھا مثلاً دیکھئے، لیجئے۔ دعوئے یعنی دعوئے میں جہاں واؤ کے بعد ہمزہ جھٹکے سے پڑھا جاتا ہے وہاں یائے مقصورہ دوسری یائے پر چڑھ کر اشباع کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ ہم اس یائے مقصورہ کو ہمزہ قرار نہیں دے سکتے کیونکہ ہمزہ صرف جھٹکے سے پڑھا جاتا ہے یائے مقصورہ کو بطور ہمزہ پہچاننا نحو ناآشنائی کے طفیل میں ہے۔ آشنائی میں بھی آخری یائے سے پہلے یائے مقصورہ ہے جو اشباع کی حالت پیدا کرتی ہے جیسے الف پر الف مقصورہ اشباع کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

میرے خیال میں اردو زبان میں ہمزہ کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے اور ڈاکٹر گوپی چند جی نارنگ کا یہ استدلال "اردو میں صدیوں سے ایک رسم چلی آئی ہے کہ اٹھئے، کیجئے، کئے، دئے، لیے وغیرہ الفاظ کو اکثر ہمزہ سے لکھتے ہیں سو سب آنکھیں بند کئے اس لکیر کو پیٹتے چلے جا رہے ہیں" حقیقت پر دال نہیں۔ ہمزہ اہل ادب کے نزدیک جھٹکے ہی سے پڑھا جاتا ہے تو ہمزہ ہے اور جب اسے اشباع دیا گیا ہے تو یہ یائے مقصورہ ہے۔ ان دونوں کی املا کی صورت میں مماثلت وجہ اشتباہ ہے اور بس۔

(اثر آغا غلش کاشمیری)

ہماری زبان

کو مضامین و مراسلات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیں کہ وہ کاغذ کے ایک طرف صاف لکھے ہوں۔

(ادارہ)

رجسٹری آفسوں میں اردو میں بھی دستاویز لیے جائیں گے

جلد ہی سرکاری احکامات جاری کئے جا رہے ہیں

پٹنہ۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے دفتر کے قریبی حلقوں سے ۔۔۔ معلوم ہوا ہے کہ صدر انجمن جناب غلام سرور سے وزیر محصولات بہار جناب اندر دیپ سنگھ نے ایک ملاقات کے دوران بتایا کہ ان کے نام جو درخواست بھی اردو زبان اور اردو رسم خط میں آئے گی اس پر بھی کارروائی کی جائے گی۔ بات چیت کے دوران انھوں نے صدر انجمن کو یقین دلایا کہ وہ جلد ہی سرکاری احکامات جاری کر دیں گے کہ بہار بھر کے تمام رجسٹری آفسوں میں اردو زبان اور رسم خط میں بھی دستاویز اگر پیش کئے جائیں تو انہیں قبول کیا جائے۔ (سنگم)

تمام ۱۴ علاقائی زبانوں کو سرکاری درجہ نہ دیا تو ایجی ٹیشن شروع کیا جائے گا

مدراس۔ تامل ناڈو کے طلبہ نے یہاں دو روزہ "اینٹی ہندی طلبہ کانفرنس" میں کئی ریزولیوشن منظور کئے ہیں۔ ان میں سے ایک ریزولیوشن میں مرکز سے کہا گیا ہے کہ اگر مرکز نے یکم جنوری ۱۹۶۹ء تک تمام ۱۴ علاقائی زبانوں کو سرکاری درجہ نہ دیا گیا تو اینٹی ہندی ایجی ٹیشن دوبارہ شروع کر دیا جائے گا۔

تامل ناڈو کے طلبہ نے کہا کہ وہ آئندہ سال ایک ایجی ٹیشن ڈاک اور تار کے دفتروں پر ہندی کے بورڈوں کے خلاف شروع کرنے کے لیے تیار ہیں۔ انھوں نے ڈی ایم کے کی حکومت سے یہ بھی کہا ہے کہ وہ سہ لسانی فارمولے کو ختم کر کے صرف دو زبانیں تامل اور انگریزی رکھے۔ (الجمعیۃ)

اردو کو یوپی کی علاقائی زبان کا درجہ ملنا چاہیے

مئوناتھ بھنجن۔ تاملی ڈونگرا اوڈیہر ریاست کے صنعت و روزگار کے وزیر جناب پربھو نارائن سنگھ نے ۲۰ رمئی کو ایک اجتماع عام کو خطاب کرتے ہوئے پورے جوش و خروش کے ساتھ کہا کہ ہماری پارٹی کا اردو زبان سے گہرا لگاؤ ہے اور ہم ہندی کے بعد اردو کو دوسری علاقائی اور سرکاری زبان تسلیم کرانے کی ہر ممکن جد و جہد کریں گے اور اس کا جائز و قانونی حقوق دلوا کر ہی دم لیں گے۔ (الجمعیۃ)

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے وفد کی نائب وزیر اعلیٰ سے ملاقات

پٹنہ۔ آج بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا ایک نمائندہ وفد صدر انجمن جناب غلام سرور کی قیادت میں نائب وزیر اعلیٰ بہار جناب کرپوری ٹھاکر سے ملا۔ جس میں جناب غلام سرور نے اردو میں لکھا ہوا میمورنڈم پڑھ کر سنایا اور وزیر تعلیم کو پیش کیا۔ انجمن کی تاریخ میں پہلی بار اردو میں میمورنڈم پیش کیا گیا تھا۔ نائب وزیر اعلیٰ نے اپنے جواب میں کہا کہ اردو کے متعلق ان کا نقطہ نظر صاف اور واضح ہے جب ۳۳ نکاتی پروگرام میں اردو کو بہار کی ثانوی سرکاری زبان بنائے جانے کا معاملہ آیا تو انھوں نے صفائی سے یہ کہا تھا کہ اگر اسے پروگرام میں شریک نہ کیا گیا تو وہ گورنمنٹ چھوڑ دیں گے۔ آج بھی وہ اس موقف پر قائم ہیں اور انھوں نے خالصتاً ہندی دوستوں کی مجلس میں اس کا اعادہ کیا ہے کہ اردو کی مخالفت بے معنی ہے اور حکومت اس مخالفت کا خیال نہ کرے گی موصوف نے وفد کے صدر سے وعدہ کیا کہ میمورنڈم میں جتنی باتیں مذکور ہیں ان میں اب تاخیر نہ ہوگی۔ وزیر تعلیم نے اسی وقت ایجوکیشن سکریٹری کو تحریری طور پر ہدایت کی کہ "وہ اردو زبان کے متعلق لگ بھگ ایک ڈیڑھ مہینہ پہلے باتیں کر چکے ہیں اور سرکار کی پالیسی بھی بتلا چکے ہیں۔ اس کام میں کچھ دیر ہو رہی ہے۔ مہربانی کر کے ایک چھوٹے سے ڈیلیگیشن سے مل کر اپنی رائے کے ساتھ فائل ان کے پاس بھیج دیں ہر حالت میں کام تیزی سے ہونا چاہیے۔

عام طور پر اردو کے ممبران نائب وزیر اعلیٰ سے بات چیت کر کے مطمئن لوٹے امید کی جاتی ہے کہ ۱۱ رجون کو انجمن کی مجلس عاملہ کی بیٹھک میں صورت حال کا جائزہ لیا جائے گا اور اگلے اقدام کا فیصلہ کیا جائے گا۔

سوائے جن سنگھ کے سب پارٹیاں اردو کو

دوسری سرکاری زبان بنانے کے حق میں

لکھنؤ۔ ریاستی نائب وزیر اعلیٰ اور وزیر تعلیمات جناب رام پرکاش کے ایک بیان کی یو، پی سمیکت سوشلسٹ پارٹی کے جائنٹ سکریٹری جناب راما شنکر گپتا نے چیلنج کرتے ہوئے تردید کی ہے۔

جناب راما شنکر گپتا نے اپنے ایک اخباری بیان میں کہا کہ ریاستی وزیر تعلیمات جناب رام پرکاش کا بیان کل کے اخباروں میں چھپا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ یو، پی میں اردو کو دوسری زبان کا درجہ نہیں دیا جا سکتا اور سمیکت ودھائک دل کی کوئی بھی قانون ساز یونٹ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے پر تیار نہیں ہے۔

انھوں نے کہا کہ "ریاستی وزیر تعلیمات کا یہ بیان بہت گمراہ کن ہے۔ اس کی وضاحت کی ضرورت ہے۔"

جناب راما شنکر گپتا نے کہا کہ "میں ریاستی حکومت کی تعلیمی پالیسی پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن یہ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ جہاں تک سمیکت ودھائک دل کی دوسری پارٹیوں کا تعلق ہے سوائے جن سنگھ کے سب پارٹیاں متفقہ طور پر اردو کو ریاست کی

دوسری سرکاری زبان بنانے کے لیے تیار ہیں۔ اور سمیکت ودھائک دل کے کم از کم پروگرام کے خاص طور پر چوتھی شق میں صاف طور پر واضح کر دیا گیا ہے کہ سوائے جن سنگھ کے دوسری تمام پارٹیاں (ودھائک دل کی ممبر) اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا حق تسلیم کرتی ہیں۔

ایس۔ ایس۔ پی لیڈر نے کہا کہ

"جہاں تک ایس، ایس، پی کا تعلق ہے وہ اس کو صحیح سمجھتی ہے کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا ریاست میں درجہ دیا جائے اور اس کو پڑھانے اور اس کے فروغ کی تمام سرکاری سہولتیں دی جائیں۔"

ایس ایس، پی لیڈر جناب گپتا نے کہا کہ "وزیر تعلیم سمیکت ودھائک دل میں شامل دوسری پارٹیوں کی پالیسی اور وعدوں سے انحراف نہیں کر سکتے محض یک طرفہ اور یک رخی پالیسی بنانے کے لیے" انھوں نے کہا کہ "اگر کمیاں پالیسی رکھتے ہیں انھیں کچھ وقت تھی تو ان کو سمیکت ودھائک دل کے حلقے میں صلاح مشورہ کر لینا چاہیے تھا۔ اور اس کے بعد کوئی فیصلہ ہونے پر اس پر عمل کرنا چاہیے تھا۔ (قومی آواز)

انجمن ترقی اردو شاخ دیوبند کا انتخابی جلسہ

انجمن ترقی اردو شاخ دیوبند کا جدید انتخاب متفقہ طور سے ۱۳ر مئی ۶۷ء کو عمل میں آیا۔

۱۔ جناب پروفیسر مہابیر پرشاد صاحب (ایم۔ اے) صدر
۲۔ " مولانا سید انظر شاہ صاحب۔ نائب صدر
۳۔ " مولوی محمد حنیف صاحب وکیل "
۴۔ " اعجاز احمد قاسمی صاحب۔ جنرل سکریٹری
۵۔ " حافظ وصی الزماں صاحب۔ سکریٹری
۶۔ " حاجی ماسٹر ظہور احمد صاحب۔ خزانچی
۷۔ " مولانا محمد عثمان صاحب (پریسیڈنٹ میونسپل بورڈ) رکن مجلس عاملہ
۸۔ " نسیم احمد صاحب عثمانی۔ رکن مجلس عاملہ
۹۔ " محمد جواد صاحب عثمانی۔ "
۱۰۔ " ماسٹر طفیل احمد صاحب "
۱۱۔ " اطہر صدیقی صاحب "
۱۲۔ " مولانا سید جلیل حسین "
۱۳۔ " محمد حبیب صاحب صدیقی "
۱۴۔ " کامریڈ محمد اصغر صاحب انصاری "
۱۵۔ " ماسٹر ہر سروپ صاحب گپتا "
۱۶۔ " محمد لیٰسین صاحب قریشی میونسپل کمشنر "
۱۷۔ " حاجی محمد ابراہیم صاحب انصاری "

میسور میں بزم اقبال

انجمن اشاعت اردو میسور نے بزم اقبال کا انعقاد کیا اور اقبال کی تصاویر و نوادر پر مشتمل ایک نمائش کا افتتاح ہوا۔

صدر انجمن ہذا حضرت سید نذیر احمد صاحب (علیگ) پرنسپل ایوننگ کالج میسور یونیورسٹی نے صدارت فرمائی۔

معتمد انجمن جناب سلیم تمنائی نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نمائش میں پیش کی گئی حضرت اقبال کی تصاویر کا تعارف فرمایا اس نمائش میں جنوبی ہند کے مشہور آرٹسٹ جناب میر شوکت علی اور جناب فقیر محمد صوفی کی بنائی ہوئی حضرت اقبال کی تصاویر بھی تھیں۔ ڈاکٹر موصوف کے انگریزی اور اردو غیر مطبوعہ خطوط اور تحریر بھی نمائش کی زینت تھی۔ آپ کے اکثر اشعار انجمن کے اجلاسوں میں موضوع بحث رہے۔ ان سے متعلق حضرت نیاز فتح پوری جناب رشید احمد صدیقی، جناب غلام السیدین وغیرہ کے خطوط بھی پیش کئے گئے تھے اس کے علاوہ سلطان ٹیپو کے غیر مطبوعہ خطوط، کتبے، فرمان اور ان کے دستخط شدہ کتابوں کے فوٹو بھی تھے جسے حضرت اقبال نے حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اور حاصل بھی کیا تھا

نمائش سے متعلق مندرجہ بالا تفصیل پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر اقبال کے سفر میسور کے حالات بیان کرتے ہوئے اقبال کی نایاب تقریر پیش کی گئی جو قیام میسور میں موصوف نے کی تھی۔

جناب منیر عاقل شاہی، مظہر الصمد شاہد ایم۔ اے (علیگ) اور خلیل احمد بے باک نے اقبال کے حضور نذرانہ عقیدت نظم کی صورت میں پیش کیا۔ جناب سلیم تمنائی صاحب نے "حضرت اقبال بارگاہ ٹیپو میں" کے عنوان سے ڈاکٹر اقبال کے اس مراقبہ کا ذکر کیا جو آپ نے روضۂ سلطانی میں کیا تھا۔ پھر جاوید نامہ کا وہ حصہ ترجمہ کی صورت میں پیش کیا جس میں پیر رومی کے ساتھ اقبال کی سلطان ٹیپو سے ملاقات ہوتی ہے اور فلسفۂ موت و حیات سلطان کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔

اردو جماعتوں کے قیام کی درخواستیں

محبوب نگر۔ انجمن ترقی اردو شاخ محبوب نگر کی نمائندگی پر سکریٹری ضلع پریشد نے اردو جماعتوں کے قیام کے لیے ۲۵ر مئی ۱۹۶۷ء تک درخواستیں پیش کرنے کا موقع دیا ہے۔ درخواستیں پر وفارمے کے مطابق صدر مدرس سے تکمیل کرا کے صدر تعلیمی کمیٹی کی سفارش کے ساتھ ضلع پریشد کے دفتر پر تاریخ معینہ تک داخل ہو جانی چاہئیں۔ درخواست کا پروفارما نصرت فاروقی صاحب معتمد انجمن ترقی اردو شاخ محبوب نگر سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اردو کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کیا جائے

وزیر اعلیٰ سے ادبی انجمنوں کی درخواست

ٹانڈہ۔ یہاں کی تمام ادبی و تعلیمی انجمنوں کی طرف سے وزیر اعلیٰ یو.پی جناب چرن سنگھ کے نام ایک یادداشت بھیجی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اردو زبان یو.پی کی کثیر آبادی کی زبان ہے اور دستور ہند میں درج چودہ قومی زبانوں میں سے ایک ہے لیکن آج تک یو.پی کی کانگرسی حکومت نے اسے نظر انداز کیا جس کے سبب اردو دوستوں میں سخت بے چینی پائی جاتی ہے یادداشت میں کہا گیا ہے کہ پہلی بار یو.پی میں غیر کانگرسی وزارت قائم ہوئی ہے لہٰذا اب اردو دوستوں کی شکایات دور ہونا چاہیئے اور ان کے مطالبات جلد از جلد تسلیم کر لینا چاہیئے۔

یادداشت میں کہا گیا ہے کہ اردو کو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان تسلیم کیا جائے، صوبائی دفتروں اور عدالتوں میں اردو میں بھی درخواستیں قبول کی جائیں، سرکاری اعلانات اردو میں بھی جاری کئے جائیں۔ ووٹر فہرستیں اردو میں بھی تیار کرائی جائیں۔

ضلع ہزاری باغ میں اردو کی تعلیم سے بے اعتنائی

ہزاری باغ۔ بلاشبہ جمہوری حکومت کے اولین فرائض میں ہر جگہ بنیادی تعلیم کا انتظام بھی ہے لیکن یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ سابق محکمۂ تعلیم حکومت بہار باوجود تمام تعلیمی ترقیوں کے اس اہم اور بنیادی ضرورت کو کما حقہ پورا کرنے سے قاصر رہا۔ ابھی دفتر جمعیۃ علماء ریاست بہار پٹنہ عظیم میں جمعیۃ علماء بیرون کے نائب صدر نے اپنے ایک حلقے کے دورہ کی رپورٹ میں جو تفصیلات بھیجی ہیں وہ انتہائی افسوسناک ہے۔ موصوف نے پندرہ ایسی بستیوں کی فہرست بھیجی ہے جہاں اسکول تو ہے اردو پڑھنے والوں کی تعداد بھی کثیر ہے۔ لیکن بار بار درخواستیں دینے کے بعد بھی اردو معلم نہیں دئے گئے اور دس ایسی بستیوں کی فہرست ہے جہاں اردو پڑھنے والے کافی تعداد میں بستے ہیں لیکن انھیں ابھی تک اسکول نہیں دیا جاسکا ہے۔ ہم دونوں مندرجہ فہرست کو وزیر تعلیم حکومت بہار کی خدمت میں بھیج رہے ہیں ہمیں امید ہے کہ موصوف فوراً متوجہ ہوں گے اور ان پسماندہ علاقوں میں اردو معلمین اور اس کا نظم کر کے حق تلفیوں کا ازالہ کریں گے۔

نمبر شمار	نام گاؤں	اردو آبادی	نام اسکول جہاں اردو تعلیم نہیں ہے	مقام
۱	برہاسویا ڈیہہ	۴۰۰	مڈل اسکول برہاسویا ڈیہہ	برہاسویا ڈیہہ
۲	کوہوا	۱۵۰	ال پی اسکول	کوہوا
۳	چالو	۲۵۰	"	چالو
۴	پرساپیڑا	۴۰۰	"	پرساپیڑا
۵	بھادانند	۲۵۰	"	بھادانند
۶	بڑکی بیرگی چھوٹکی بیرگی	۴۰۰	اپر پرائمری اسکول	بیرگی
۷	امرا	۴۰۰	"	امرا
۸	کھانگی	۳۰۰	مڈل اسکول	کھانگی
۹	کاوہ بار	۴۰۰	یو پی اسکول	کاوہ بار
۱۰	لگلو	۴۰۰	ال پی اسکول	لگلو
۱۱	بیسکو	۱۵۰۰	یو پی اسکول	بیسکو
۱۲	چینیو	۲۰۰۰	ال پی اسکول	چینیو
۱۳	جھمی کھنڈا	۲۰۰	یو پی اسکول	جھمی کھنڈا
۱۴	ڈومر چینیو	۱۰۰	ال پی اسکول	ڈومرا چینیو
۱۵	نیاسو	۲۰۰	مڈل اسکول	نیاسو

نمبر شمار		گاؤں کی آبادی	جہاں اردو اسکول کی سخت ضرورت ہے
۱	موضع سوانگ	۴۰۰	سوانگ
۲	موضع بیسکو	۱۵۰۰	بیسکو
۳	موضع پینگ	۳۵۰	پینگ
۴	موضع نیرکی خورد	۲۵۰	نیرکی خورد
۵	موضع کاچھو	۷۰۰	کاچھو
۶	بالی ڈیہہ	۴۰۰	بالی ڈیہہ
۷	امرا	۴۰۰	امرا
۸	لوہیا برلا ڈیہہ	۴۰۰	لوہیا برلا ڈیہہ
۹	کھرکھرد	۱۰۰	کھرکھرد
۱۰	سویا ڈیہہ	۴۰۰	سویا ڈیہہ

(سیاست جدید)

اردو کے سوال پر دو ھائک دل کی بدعہدی پر اضطراب

لکھنؤ۔ متحدہ محاذ سے تعلق رکھنے والی ترقی پسند پارٹیوں کے سامنے اردو کا سوال ایک کسوٹی بن کر ابھرا ہے۔ اس کسوٹی پر ان کے مستقبل کا دار و مدار ہے یو.پی اسمبلی میں کمیونسٹ پارٹی (مارکسی) کے واحد ممبر جناب شرافت حسین رضوی نے یقین دہانیوں پر عمل درآمد سے فرار اور گریز کی پالیسی سے تنگ آکر محاذ سے علیحدگی اختیار کرلی ہے اسی طرح ایک سوشلسٹ ممبر اسمبلی جناب چندر بلی سنگھ نے ایک ملاقات میں بتایا کہ محاذ سے علیحدگی کی وجہ طاقت ور پارٹیوں کی آمرانہ ذہنیت ہے اردو کے سوال پر ری پبلکن پارٹی کے ممبر اور نائب وزیر خوراک جناب شمیم عالم نے ایک بیان میں کہا کہ بلاشبہ میری پارٹی کے انتخابی منشور میں دو ھائک دل کے ۲۳ نکاتی پروگرام ہی کو قانونی حیثیت دئے جانے کا یقین دلایا گیا تھا پروگراموں پر عمل درآمد میں تاخیر تو ہو سکتی ہے لیکن انحراف ممکن نہیں۔ اگر منحرف ہونے کی کوشش کی گئی تو اور میری پارٹی نے علیحدگی کی ہدایت کی تو میں بغیر کسی تاخیر کے وزارت سے باہر آجاؤں گا۔

جناب شمیم عالم نے اپنی اس تقریر کا بھی حوالہ دیا جو گورنر کے خطبے کے موقع پر یکم اپریل کو اسمبلی میں کی تھی۔ ان کی اس تقریر کو ری پبلکن پارٹی بلند شہر نے پمفلٹ کی شکل میں شایع کیا ہے

اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے جناب شمیم عالم نے کہا تھا کہ باہر رکشہ والوں کی زبان سمجھ میں آتی ہے کسانوں کی زبان سمجھ میں آتی ہے دوکانداروں کی زبان سمجھ میں آتی ہے لیکن اس ایوان کی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی۔ انھوں نے اس موقع پر مطالبہ کیا تھا کہ ایوان کے جو ممبران چاہیں ان کو اردو ہی میں ایجنڈا مہیا کیا جائے سوالات اور درخواستیں اردو ہی میں دے سکیں۔ ان کو جوابات بھی اردو میں دئے جائیں۔

جناب شمیم نے کہا کہ اردو کا مسئلہ اس لیے نہیں ہے کہ اردو جاننے والے ریل کی پٹریاں نہیں اکھاڑتے لوٹ مار نہیں کرتے اور اپنے جسم پر تیل چھڑک کر آگ نہیں لگاتے۔

سوال یہ ہے کہ کسی تسلیم شدہ سچائی اور حقیقت کا اعتراف کرانے کے لیے تشدد کی زبان کا استعمال ضروری ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ بڑی افسوسناک اور بدقسمتی کی بات ہے۔ (سیاست جدید)

ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کے تحت مشاعرہ

ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کے زیر اہتمام حیدرآباد میں دوسرا سالانہ کل ہند مشاعرہ ہوا جس کی صدارت الحاج نواب میر احمد علی خاں صدر انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش (سابق وزیر داخلہ حکومت آندھرا پردیش) نے کی اور مہمان خصوصی جناب کونڈہ لکشمن باپو جی وزیر اطلاعات حکومت آندھرا پردیش تھے۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر پرو چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے مشاعرہ کا افتتاح کیا مشاعرہ کے آغاز سے پہلے ممتاز شاعر مخدوم محی الدین نے ادبی ٹرسٹ کے قیام کارکردگی اور افادیت کے تعلق سے مختصر مگر جامع تقریر کی اور بتلایا کہ گذشتہ سال مشاعرہ کی ۸ ہزار آمدنی سے جس ٹرسٹ کا قیام عمل میں آیا تھا اب اس کا مالیہ ایک سال کے اندر تیس ہزار روپیہ ہو چکا ہے اس مشاعرہ میں ہندوستان کے ممتاز شعرا نے شرکت کی۔

(بقیہ کالم ۲ کا) ۔۔۔ بتایا گیا ہے۔

بہتر ہوتا کہ اس انتخاب کے بجائے پورا مقالہ شائع کر دیا جاتا تاکہ اردو میں ایک صنف ادب کی حیثیت سے سفرناموں کا درجہ متعین ہو جاتا۔

تبصرے

عتیق احمد صدیقی

تین مسافر۔ ڈاکٹر قطب النسا ہاشمی

سن اشاعت ۱۹۶۶ء

ناشر: ایم۔ اے۔ حفیظ (مسرت محل) بازار نورالامرا، حیدرآباد (۲۴)

قیمت: تین روپے

"تین مسافر" اردو سفرناموں پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے سے انتخاب ہے جس میں تین سفرناموں پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کی اشاعت کا اہم مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ "یہ تین سفرنامے تین مسافروں کے مشاہدات کا اظہار ہیں جو ہندوستان کے تین گزرے ہوئے اہم دور کی ترجمانی کرتے ہیں" یہ تین سفرنامے ہیں: (۱) مثنوی نادر (نادر) (۲) سفرنامہ روم و مصر و شام (شبلی) (۳) ساحل اور سمندر (سید احتشام حسین)

مثنوی نادر میں نواب اعظم جاہ والی ارکاٹ کے سفر (۱۸۲۲ء؟) کا حال بیان کیا گیا ہے۔ لیکن مثنوی کے شاعرانہ انداز بیان نے سفرنامہ کی حیثیت کو ابھرنے نہیں دیا۔ ناظر کا بیان کافی مفصل ہے لیکن واقعات کے بیان بہت نامکمل ہیں اور اسی لیے ان کی توضیح میں مقالہ نگار کو ایک دوسری کتاب بہار اعظم جاہی سے جابجا مدد لینی پڑی پھر اس مثنوی سے نہ ملکی حالات پر کوئی روشنی پڑتی ہے اور نہ نواب اعظم جاہ کی زندگی پر۔ سفرنامہ روم و مصر و شام پر بحث پڑھتے ہوئے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی نے مداحی سلطان ترکی و اہل ترکستان کے علاوہ اس سفرنامہ میں کچھ نہیں لکھا۔ "ساحل اور سمندر" پر کافی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ امریکی زندگی اور وہاں کی تہذیب کے بارے میں احتشام صاحب کے تاثرات کے بعض تجزیے قابل قدر ہیں۔

ان سفرناموں کی اہمیت نے مقالہ نگار کے انداز بیان پر بھی اثر ڈالا ہے۔ پہلے حصہ کا انداز بیان بہت الجھا ہوا مبہم اور زبان کی غلطیوں سے پر ہے۔ آخری حصے ("ساحل اور سمندر" کی بحث) میں وضاحت اور بیان کی صفائی کا احساس ہوتا ہے۔ غالباً "مثنوی نادر" میں ایسا مواد ہی موجود نہیں تھا کہ اس پر سفرنامہ کی حیثیت سے بحث کی جا سکتی ہے۔

"مثنوی نادر" کی لسانی خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے محض رسم خط کے اختلاف کو بھی زبان کا فرق قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً قدیم رسم خط میں یائے معروف و مجہول کا امتیاز نہیں تھا۔ یہاں اس فرق کو زبان کا فرق قرار دے کر

ہے کو قدیم دکنی اور نی کو مروجہ

ہندگی ۔ ہندگی

(باقی کالم ۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر نصیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ سے شایع کیا